تہذیبوں کے تصادمی قواعد، اسلاموفوبیا کے مفہومی عناصر

مؤلف: عباس عیسی زادہ، سید حسین شرف الدین
مترجم: شبیہ عباس خان

اسلاموفوبیا کی تعریف عام طور سے مسلمانوں اور اسلامی مظاہر سے بے بنیاد اور غیر معقول دشمنی و نفرت سے کی جاتی ہے۔ بعض محققین نے اس تعریف کی اصل اور خاص کر اس کی "بے بنیاد اور غیر معقولیت" کی شرط کو قابل بحث بتایا ہے۔ان موضوعات اور مبانی کی بہتر تفہیم اور عمیق تجزیے کے لئے ہم کو کلاسیکل متون اور اس ضمن میں موجود معاصر تحقیقات کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔

مغربی دنیا میں اسلاموفوبیا کا موضوع انتہائی پیچیدہ نظریات پر مبنی ہے۔ مستشرقیت (orientalism) ، تہذیبوں کا تصادم (clash of civilizations)، ثقافتی نسل پرستی (cultural racism) اور کثیر الثقافتی عقیدہ (multiculturalism) ان میں سے اہمترین نظریات ہیں۔اسلاموفوبیا کی بہتر تفہیم اور عمیق تجزیے کے لئے ہم کو ان نظریات سے متعلق کلاسیکل متون اور معاصر متون کا مطالعہ کرنا ہوگا۔[1]

گذشتہ تین دہائیوں کے دوران، "مغربی میڈیا میں اسلام اور مسلمانوں کی نمائندگی" کے عنوان سے تحقیقات میں مقدار اور معیار دونوں لحاظ سے نمایاں اور چشم گیر اضافہ ہوا ہے۔ تحقیق کے اس شعبے نے اپنے نظریات کی صحت اور بنیاد کے سلسلے میں ہمیشہ سے بعض مشہور معاصر سیاسی نظریات جیسے مستشرقیت اور تہذیبوں کا تصادم سے استفادہ کیا ہے۔ ان مختلف تحقیقی دائروں کا آپس میں وجہ اشتراک یہ ہے کہ ان میں اس سوال کا جواب دیا جاتا ہے کہ کیوں مغربی میڈیا میں مسلمانوں کو ایک خاص نقطہ نظر سے پیش کیا

1 Faimau,Gabriel, Teaching and Learning Guide for the Conflictual Model of Analysis in Studies on the Media Representation of Islam and Muslims: A Critical Review, Sociology Compass, Vol 9, No 7

جاتا ہے۔ جبرئیل فیماؤ جیسے بعض محققین نے اس قسم کے تحقیقی دائروں کی طرف رجوع کرنے کے نتائج کو منفی جانا ہے۔ ان کا ماننا ہے" ان رویوں کی وجہ سے، بلا شبہ اسلام اور مغربی دنیا کے بیچ تصادم اور کشمکش بڑھے گا جس کے نتیجے میں ان دو عظیم تہذیبوں کے بیچ تعامل اور بات چیت کا امکان ختم ہو جائے گا۔"[1]

تصادم اور تعامل: دو نمونے

کلی طور پر "مغربی میڈیا کا مسلمانوں کے ساتھ تعامل" کے موضوع کی وضاحت کے لئے ہم اس کو دو نمونوں تصادم اور تعامل میں خلاصہ کر سکتے ہیں۔

تصادمی نمونہ اسلام اور مغرب کے ایک دوسرے کے آمنے سامنے آنے اور ان کے بیچ تصادم کو ایک دوطرفہ تنازعہ بتاتے ہوئے اس کے لئے "وہری زبان" کا استعمال کرکے اس پر تحقیق کرتا ہے۔ یہ تجزیاتی نمونہ، مغربی میڈیا میں اسلام کو پیش کرتے وقت دوہرے زمرہ بندی کا استعمال کرکے ان کا تجزیہ کرتا ہے۔ مثال کے طور پر مغرب، متمدن ــ بربر، معقول - غیر معقول وغیرہ۔ اس تقابل میں ایک طرف کو طاقتور، متمدن اور مغرب کا نمائندہ بتایا جاتا ہے وہیں دوسری طرف کو کمزور، غیر شائستہ، شیطانی، بربر اور غیر متمدن دکھایا جاتا ہے جس کا اشارہ مشرق کی طرف بالخصوص اسلام ہے۔[2]

چونکہ دور حاضر کے مغربی میڈیا میں اور اسی طرح اسلام و مسلمین کے ساتھ مغربی دنیا کے طرز تخاطب میں تصادم کو ہمیشہ فرض جانا جاتا ہے لہٰذا "مستشرقیت" اور "تہذیبوں کے تصادم" جیسے نظریات کی بنیاد پر وہ لوگ اپنی تحقیقات کو انجام دیتے ہیں جس کا نتیجہ تقابل و تصادم ہی نکلتا ہے۔

دوسرا نمونہ یعنی تعاملی نمونہ، وہ ہے جس میں اسلام اور مغربی دنیا کے درمیان مناسب گفتگو اور مفید تعامل کے امکان کی بنیاد پر تاریخی روابط اور اس کے صحافتی مثبت آثار اور نتائج کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ اس نمونہ کے تجزیے میں مغربی اور اسلامی تمدن کے درمیان بحث و گفتگو کا امکان امیدوارانہ ہوتا ہے، جس سے مغربی میڈیا میں اسلام اور مسلمانوں کی ایک مثبت تصویر سامنے آتی ہے۔ اور نظری اعتبار سے "شناختی

1- Teaching and Learning Guide for the Conflictual Model of Analysis in Studies on the Media Representation of Islam and Muslims

۲- ایضاً

سیاست" اور "کثیر الثقافتی" جیسے اصول وجود میں آتے ہیں جو کہ تعاملی نمونہ کا نتیجہ ہیں۔

تقابلی نمونہ پر تنقید: اس نمونہ کو اپنانے سے صرف اس موقف کو تقویت ملتی ہے کہ تاریخی لحاظ سے اسلام اور مغربی تمدن کے درمیان صرف تصادم اور ٹکراؤ رہا ہے اور دور حاضر میں مغربی میڈیا کے ذریعے اسی موقف کی ترویج ہوتی ہے کہ اسلامی دنیا سے گفتگو اور تعامل بے فائدہ ہے۔ واضح ہے کہ نزاع اور اختلاف کے فرضیہ کی بنیاد پر اسلام اور مغربی دنیا کے درمیان ایک مثبت اور مفید رابطے کی امید نہیں کی جا سکتی۔ انہیں غلط فرضیات کی بنیاد پر مغربی محققین اسلام سے خوف زدہ ہونے کے ساتھ ساتھ دوسروں کو بھی ہراساں کرتے ہیں، جیسے الیزابت پول اسلام اور مغربی دنیا کے بیچ تقابل اور تصادم کے فرضیے کی بنیاد پر اسلاموفوبیا کے سلسلے میں اس طرح آگاہ کرتا ہے:

۱۔ اسلام ترقی یافتہ دنیا کے تمام کارناموں جیسے ڈیموکریسی کا مخالف ہے اور عالم بشریت پر مسلمانوں کی خدمات اور ان کے تاریخی کارناموں کو یکسر بھلا دیا گیا ہے۔

۲۔ خشونت جیسے منفی ارجاعات کو اسلام سے مخصوص کرکے اور مثبت ارجاعات کو مغربی دنیا سے مخصوص کرکے اسلاموفوبیا کی بنیاد رکھی ہے۔

۳۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ تصادمی رویہ سے مغربی میڈیا میں مسلمانوں کی تصویر کشی پر منفی اثر پڑتا ہے۔ اس نمونہ میں مسلمانوں کی تصویر کشی کے لئے میڈیا دو ایک جیسے اور مرتبط طریقوں کو استعمال میں لیتا ہے:

الف: غالب آنے والا رویہ اور احساس برتری: اس میں مسلمانوں کو بیگانہ، اجنبی اور غیر مغربی عقائد کو ماننے والا کہہ کر پیش کیا جاتا ہے جس سے مغربی دنیا کو اسلام پر برتری کے نظرئے کی تقویت ہوتی ہے۔

ب: یکساں اور ہم آہنگ سازی: اس میں مسلمانوں کی جماعت کو ایک متحد اور منظّم گروہ دکھایا جاتا ہے۔ اس نظریہ کا ایک معقول نتیجہ یہ سامنے آتا ہے کہ تعصب اور من گھڑت عقائد کی بنیاد پر اگر مسلمانوں کے کسی بھی چھوٹے سے گروہ میں کوئی منفی خصوصیت پائی جاتی ہے تو اس کو پوری امت مسلمہ سے وابستہ کرکے عظیم اسلامی تہذیب کو داغ دار کیا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر کچھ مسلمان کسی بھی وجہ سے خود کش حملہ انجام دیتے ہیں تو پوری دنیا کے مسلمانوں کو دہشتگرد کہا جاتا ہے۔[1]

1- Teaching and Learning Guide for the Conflictual Model of Analysis in Studies on the Media Representation of Islam and Muslims, p 326

تصادمی ماڈل پر اتنی نقد و تنقید ہونے کے باوجود، اسلاموفوبیاکے سلسلے میں جتنی بھی تجزیات اور تحقیقات کی گئی ہیں، ان سب نے اسی ماڈل کے نظری اصول اور مبانی کو بنیاد بنایا ہے۔ اسی لئے ان اصولوں اور مبانی خاص طور پر "تہذیبوں کا تصادم" کا تجزیہ اور تحلیل بے حد ضروری ہے۔اس مقالہ میں "تہذیبوں کے تصادم" کے نظرئے کا تفصیل سے جائزہ لیا جائے گا کیونکہ یہی مفہومی دائرہ معاصر اسلاموفوبیا کی بنیاد تسلیم کیا جاتا ہے اور اسی طرح گذشتہ کئی دہائیوں سے مغربی سیاستدانوں اور میڈیا کا اسلام اور مسلمانوں سے طرز تخاطب کی تربیت کر رہا ہے۔

تہذیبی تصادم کا نظریہ

تہذیبی تصادم کا نظریہ ایک طرف تو دنیائے اسلام میں مندرجہ ذیل منفی خصوصیات کو اجاگر کرتا ہے: حکمت و رواداری کا فقدان، تصادم اور تشدد کے در پے ہونا، جمود اور عقلی پسماندگی، مغربی دنیاکے متعلق منفی نظریہ اور ماڈرنیزم اور اس کے ثمرات جیسے ڈیموکریسی کا پوری طرح سے مخالف ہونا۔ دوسری جانب اسلامی تحریکوں کی توصیف کرتے ہوئے سبھی کو ایک طرف سے ریڈیکل، پر تشدد اور آیڈیالوجیکل سمجھتا ہے۔ نتیجتاً دنیائے اسلام اور تمام اسلامی جوامع میں مذکورہ خصوصیات ہونے کی وجہ سے وہ ذاتی طور پر مغربی دنیا کی شناخت، تہذیب اور تمدن کا دشمن فرض کیا جاتا ہے اور اسلام اور مغربی دنیاکے بیچ تہذیبی تصادم سے گریز غیر ممکن تلقی ہوتا ہے۔[1]

اس سلسلے میں فرانسیسی ماہر سماجیات ریمن آرون کی تھیوری "تہذیبوں کا مختلف ہونا" یا مشہور ماہر اسلامیات و مشرقیات برنارڈ لوئیس کا "تہذیبوں کا تصادم" کا نظریہ، اسی طرح مشہور امریکی مفکر ساموئل ہنٹنگٹن کا نظریہ "ثقافتی تصادم"۔ یہ سارے نظریات، تصادمی نمونہ و نظرئے کی بنیاد و اساس تصور کئے جاتے ہیں۔ اب چونکہ اسلاموفوبیاپر بحثیں اور تحقیقات ان نظریات سے بے حد متاثر ہیں لہٰذا ان کا تفصیل سے تجزیہ مفید اور فائدہ مند واقع ہوگا۔[2]

ساموئل ہانٹنگٹن کی پیدائش ۱۹۲۷ء میں نیویارک کے ایک انگریز مہاجر گھرانے میں ہوئی۔ اپنی

۱۔ سردار نیا، خلیل اللہ، بررسی و نقد دو پارادایم رقیب در تبیین اسلام گرایی در خاور میانہ، مطالعات خاور میانہ، س ۱۸، ش ۴

۲۔ ناصری طاہری، عبداللہ، مبانی و ریشہ ہای تاریخی اسلام ہراسی غرب، مطالعات تاریخ اسلام، سال اول، شمارہ دوم

ابتدائی تعلیمات کو نیویارک میں ہی پورا کرنے کے بعد، ساموئل نے ییل یونیورسٹی سے گریجویشن اور شکاگو یونیورسٹی سے ماسٹرز کی ڈگری حاصل کی۔ ساموئل ۱۹۵۱ء میں ہارورڈ یونیورسٹی سے پولیٹیکل سائنس میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد اسی یونیورسٹی میں تدریس کرنے لگے۔[۱]

ساموئل ہانٹنگٹن کی علمی ذمہ داریوں میں ہارورڈ یونیورسٹی کے "سینٹر فار اسٹراٹیجک اسٹڈیز" کی صدارت، "خارجی سیاست" نامی میگزین کی اشاعت اور امریکی پولیٹیکل سائنس ایسوسی ایشن کی صدارت شامل ہے۔ اکیڈمک سطح کی ذمہ داریوں کے علاوہ، ہنری کسینجر، ژیگنیو برژینسکی اور استانلی ہافمن کے ساتھ مل کر "امریکی کونسل برائے خارجہ تعلقات" میں اپنی سیاسی ذمہ داریاں نبھاتے رہے جو کہ امریکی خارجہ پالیسی کا اصلی اور بنیادی ادارہ سمجھا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ۱۹۶۹ء سے اب تک ساموئل مختلف سیاسی، سلامتی اور خفیہ ایجنسیوں کے عہدیدار رہے ہیں۔ "ڈیموکریسی کی تیسری لہر" اور "تہذیبوں کا تصادم" کا نام ساموئل ہنٹنگٹن کے مشہور علمی آثار میں لیا جاسکتا ہے۔[۲]

ساموئل ہنٹنگٹن نے پہلی بار ۱۹۹۳ء میں اپنے نظرئے کو "تہذیبوں کے تصادم" کے عنوان سے "خارجہ سیاست" میگزین کے ایک مضمون میں شائع کیا۔ یہ مقالہ تہذیبی تصادم کے علمی تحقیقی شعبے کا سب سے مستند اور موثر مقالہ مانا جاتا ہے اور اس کا آغاز اس جملے سے ہوتا ہے:

" عالمی سیاست ایک نئے دور میں داخل ہو گئی ہے"۔ اس نظریے کو پیش کرکے ساموئل نے جنگ سرد کے بعد پیش آنے والے بین الاقوامی واقعات کی تحلیل و تجزیہ کے لئے ایک مفہومی فریم کی بنیاد رکھی۔ وہ نظریہ جس پر وسیع پیمانے پر دنیا کے علمی اور سیاسی حلقوں میں رد عمل ظاہر کیا گیا۔ ہنٹنگٹن کے خیالات پر شدید تنقید کے باوجود، سبھی نے جنگ سرد کے بعد بین الاقوامی تعلقات کی تشکیل میں، ہنٹنگٹن کے نظری اصول و عقائد کی اہمیت اور اس کے اثرات کو تسلیم کیا۔ "تہذیبوں کا تصادم" کے نظرئے کو پیش کرکے، ہنٹنگٹن نے سیاست اور بین الاقوامی تعلقات میں اہداف، ذرائع اور اقدار کی جانب نظر ثانی کرنے پر مجبور کیا۔[۳]

ایرانی-امریکی نسل کے مشہور مورخ اروند آبراہمان کے مطابق پیراڈائمس کو ایک رائج اصل و

۱۔ امیری وحید، مجتبی، نظریہ برخورد تمدن ہا: ہانتینگتن ومنتقدانش، ص ۱۸

۲۔ صالحہ امیری، سید رضا، مفاہیم و نظریہ ہای فرہنگی، ص ۲۲۴-۲۲۵

۳۔ مفاہیم و نظریہ ہای فرہنگی، ص ۲۲۵

نظریہ میں بدلنے کے لئے جو ہر کسی کے نزدیک مقبول ہو، ضروری نہیں کہ اس پیراڈائم میں سچائی ہو۔ اس دعوے کے لئے سامنے کی مثال ہنٹنگٹن کا "تہذیبوں کا تصادم" کا نظریہ ہے۔ ۱۹۹۳ میں جب پہلی مرتبہ ہنٹنگٹن نے اپنے اس نظرئے کو پیش کیا تو دانشوروں اور علمی حلقوں میں اس کا کوئی خاص استقبال نہیں کیا گیا اور سب نے اس کو ایک عجیب، بے بنیاد اور غلط نظریہ کہہ کر نظر انداز کیا[1] لیکن ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ کے حوادث کے بعد سکہ پوری طرح پلٹ گیا اور ہنٹنگٹن کے نظرئے کو ایک خاص اہمیت اور مقام ملا۔ بہت سے سیاستدانوں، سیاسی تجزیہ نگاروں، محققین، دانشوروں اور صحافیوں نے یہ مانا کہ جو کچھ بھی ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ کے روز اور اس کے بعد ہوا، وہ بالکل وہی تھا جس کی پیشینگوئی ہنٹنگٹن نے اپنی تھیوری "تہذیبوں کے تصادم" یا یوں کہا جائے کہ دو مختلف اور مخالف تہذیبوں "دنیائے اسلام اور مغرب" کے بیچ انتھک جنگ کے عنوان سے کر رکھی تھی۔ اور اسی کے بعد سے ہنٹنگٹن کے نظرئے کو بے مثال محبوبیت ملی اور ۲۰۰۱ میں جو کتاب ہنٹنگٹن نے اپنے نظرئے کی تشریح میں "تہذیبوں کا تصادم" کے عنوان سے لیکن اس بار بغیر سوالیہ نشان کے لکھی تھی، وہ امریکا کی اس سال کی سب سے زیادہ بکنے والی کتاب ہوئی۔[2]

فوکویاما جیسے بہت سے سیاسی تجزیہ کاروں کا ماننا ہے کہ جنگ سرد کے اختتام پر تمام آیڈیالوجیکل مناقشات ختم ہو جائیں گے اور پوری دنیا پر لیبرل ڈیموکریسی کا ہی غلبہ ہوگا لیکن ان کے بر خلاف ہنٹنگٹن جنگ سرد کے اختتام کو "تہذیبوں کے تصادم" کا ایک نیا دور بتاتے ہیں اور اسی کی بنیاد پر دنیا میں جاری واقعات و حوادث کی تعبیر و تحلیل اس طرح سے کرتے ہیں جس سے ان کے اس نظرئے کے اصول و فرضیات مضبوط ہوتے رہیں۔[3]

ہنٹنگٹن نے تہذیب کو ثقافت کے اعلی ترین درجہ پر رکھتے ہوئے اس کو انسانی شناخت کا اصلی معیار بتایا ہے۔ اس کا ماننا ہے کہ اب اقوام کے بیچ جنگوں کا سلسلہ ختم ہو رہا ہے اور تہذیبوں کے بیچ جنگ کا سلسلہ

---

1. Abrahamian, Ervand, The US Media, Huntington and September 11, Third World Quarterly, Vol 24, No 3,2003
2. Abrahamian, Ervand, The US Media, Huntington and September 11, Third World Quarterly, Vol 24, No 3,2003
۳۔ نظریہ برخورد تمدن ہا: ہانتینگتن ومنتقدانش، ص ۲۲

شروع ہورہا ہے۔ اس کے نزدیک تاریخ بشریت میں وسیع پیمانے پر تنازعات اور کشمکش کا سلسلہ اس طریقے سے ہے: عصر جدید سے قبل کی سلطنتوں یا بادشاہتوں کے دور میں صوبوں اور بادشاہوں کے بیچ کشمکش (فیوڈلیزم)، جدید عصر میں ممالک اور مختلف اقوام کے بیچ نزاع (نیشنلیزم)، سرد جنگ کے دور میں کمیونسٹ اور سرمایہ دارانہ آئیڈیالوجی کے بیچ کشمکش اور سرد جنگ کے بعد تہذیبوں کے بیچ تہذیبی و ثقافتی تقابل اور تصادم۔

ہنٹنگٹن کے مطابق اب سے عالمی امور اور تعلقات، دنیا کے اِن آٹھ عظیم تہذیبوں کے بیچ عمل اور رد عمل کے نتیجے میں ہی قرار پائیں گے۔ اس کے مطابق یہ آٹھ عظیم تہذیبیں مندرجہ ذیل ہیں: مغربی تہذیب، اسلامی تہذیب، کنفیوشس، جاپانی، ہندو، اسلاو، لاطین امریکا کے آرتھوڈوکس اور اس کے آس پاس کی تہذیب اور افریقی تہذیب۔

دوسرے الفاظ میں کہیں تو دور جدید کی دنیا میں ہونے والے تنازعات اور کشمکش نہ آئیڈیالوجیکل ہوں گے اور نہ ہی اقتصادی بلکہ اب سے یہ تقابل اور تعارضات صرف اور صرف تہذیبی اور ثقافتی شناخت پر مبنی ہوں گے۔ ہنٹنگٹن کے مطابق ثقافتی شناخت کا تعلق مذہب سے ہے اور یہ دونوں (ثقافتی اور مذہبی شناخت) مل کر کسی بھی تہذیب کا سنگ بنیاد رکھتی ہیں لہٰذا چونکہ مذہب ہی کسی تہذیب کی شناخت کا بنیادی عنصر ہے، اس لئے فرنٹ لائن کی جنگیں بھی اب ہمیشہ انہیں گروہوں کے بیچ لڑی جائیں گی جو دو مختلف مذاہب کے ماننے والے ہیں۔[1]

مختلف تہذیبوں اور مذاہب میں سے اسلام اور مغرب (مسیحیت) دو ایسی اہمترین تہذیبیں ہیں جن میں ۱۴۰۰ سالہ پرانی دشمنی کی وجہ سے تشدد اور تنازعات کا خدشہ سب سے زیادہ ہے اور ان کے آپس کے تعلقات سے خونی حوادث کا جنم ہوتا ہے۔

ہنٹنگٹن کے مطابق اسلام اور مغرب کے بیچ تہذیبی تصادم کی وجہ عربوں کا توسیع پسندانہ کردار اور اسی طرح سترہویں صدی میں عرب ممالک کا مغربی دنیا پر ہجوم ہو سکتا ہے۔ گیارہویں صدی سے تیرہویں صدی کے بیچ ہونے والی صلیبی جنگیں اسی تہذیبی تنازعات کے نتیجے میں ہوئیں اور پھر اس کے بعد چودہویں سے سترہویں صدی کے بیچ عثمانی ترکوں نے صلیبی جنگوں میں کھوئی ہوئی اپنی زمینوں کو واپس لینے کے لئے

۱۔ مفاہیم و نظریہ ہای فرہنگی، ص ۲۳۰

مغربی دنیا کے خلاف جارحانہ سیاست کو اپنایا اور یورپ کے قلب وین تک پہنچ گئے۔[1]

ہنٹنگٹن کا ماننا ہے کہ ۱۹۹۰ کی دہائی کے آغاز اور جنگ سرد کے خاتمے کے بعد سے مغربی دنیا میں تہذیبی خود آگاہی وجود میں آنے لگی جس کی وجہ سے مغربی دنیا اور اہل مغرب کے لئے اسلام کا خطرہ سب سے بڑا خطرہ بن گیا۔ ہنٹنگٹن اپنے "تہذیبوں کا تصادم" کے نظرئے کی اہلیت کو ثابت کرنے کے لیے، گیارہ ستمبر اور اس کے جیسے متعدد دہشتگردانہ حملوں اور واقعات سے استناد کرتا ہے۔ اسی طرح ہنٹنگٹن تہذیبی تصادم کی زندہ مثال دیتے ہوئے، بلقان میں آرتھوڈوکس صربستانی، اسرائیل کے یہودی، ہندوستان کے ہندو، برما کے بودھ اور فلپائن کے کیتھلکس کے ساتھ مسلمانوں کے تعلقات میں تشدد کو تہذیبی تصادم کا نتیجہ بتاتا ہے۔ اپنی ایک مشہور تعبیر میں ہنٹنگٹن لکھتا ہے: "اسلام کی حدود خونی ہیں"۔ ہنٹنگٹن کے دعوؤں کا سب سے دلچسپ اور افکار کو بیدار کرنے والا حصہ ذیل کے بیانات میں خلاصہ کیا گیا ہے:

۱۔ مغربی دنیا کے لئے اصل مسئلہ اسلامی بنیاد پرستی اور القاعدہ جیسی انتہا پسند اور دہشتگرد تنظیمیں نہیں ہیں بلکہ ہمارے لئے اصل مسئلہ خود اسلام ہے۔ اسلام ایک ایسی تہذیب ہے جس کے پیروکار اپنی ثقافت کی مطلق برتری پر یقین رکھتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ اس وقت مغربی دنیا کے مقابل زیادہ کمزور ہیں اور یہی بات انہیں پریشان کرتی ہے اور اسی وجہ سے ان میں احساس حقارت اور ناامیدی پائی جاتی ہے۔[2]

۲۔ جدید دور میں تہذیبوں کی بنیاد پر نئے گروہوں کی تشکیل ہو رہی ہے جس کے نتیجے میں اسلامی تہذیب اور کنفیوشس تہذیب ایک دوسرے سے قریب ہوتے ہوتے اب بالکل ایک ساتھ ہو گئے ہیں اور مغربی تہذیب کے مقابل میں آ گئے ہیں۔

۳۔ مستقبل قریب میں دنیا پر کوئی ایک تہذیب حاوی نہیں ہو گی بلکہ متعدد تہذیبیں موجود ہونگیں اور ہر ایک دوسرے کے ساتھ تعامل کرنے پر مجبور ہے۔ کم سے کم اس دعوے کے سلسلے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہنٹنگٹن کی بات صحیح ہے۔

بعض محققین کا خیال ہے کہ ہنٹنگٹن نے "تہذیبوں کا تصادم" کے نظرئے کو برنارڈ لوئیس سے لیا

۱۔ بررسی و نقد دو پارادایم رقیب در تبیین اسلام گرایی در خاور میانہ

2 .Saed, Amir , Media , Racism and Islamophobia : the Representaion of Islam and Muslims in the Media , Sociology Compass, Vol 1, No 2,2007

ہے اور اس نظرئے کا اصل موجد در حقیقت لوئیس ہے۔ مثال کے طور پر اڈوارد سعید کا دعوی ہے کہ "تہذیبوں کا تصادم" کے نظرئے کو مشہور مستشرق اور پرنسٹن یونیورسٹی کے پروفیسر برناڈ لوئیس نے ۱۹۹۰ میں آٹلانٹک میگزین میں "مسلم غصے کی جڑیں" کے عنوان سے ایک مقالہ کی شکل میں شائع کیا تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جس میگزین میں لوئیس کا مقالہ شائع ہوا اس کے سرورق پر چھپی تصویر پوری طرح سے مقالہ کے موضوع سے مطابقت رکھتی تھی۔ وہ تصویر نہایت اشتعال انگیز اور متعصبانہ انتخاب کا نتیجہ تھی جس میں عمامہ لگائے ہوئے، لمبی داڑھیوں والا ایک موٹا انسان، امریکا کے جھنڈے کو گھور رہا ہے۔

لوئیس نے اپنے اس مقالے میں مغربی دنیا اور اسلام کے بیچ تصادم کی اصل وجہ کو "اسلام کا کلاسیکی نظریہ" بتایا ہے۔ اس کے مطابق اسلامی فقہ دنیا کو دو مخالف قطبوں میں تقسیم کرتی ہے جس میں ایک دارالاسلام (اسلامی سرزمین) اور دوسرا دارالحرب (جنگی سرزمین) کہلاتا ہے۔ اس تقسیم بندی کے مطابق، ہر وہ تہذیب جو اسلامی حدود کے باہر ہے وہ صرف غیر اسلامی ہونے کی بنیاد پر دشمن تسلیم کی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں خود لوئیس کو براہ راست نقل کرنا دلچسپ ہوگا:

> "خود مسلمانوں کے نزدیک وہ چیز جو اسلامی تہذیب کو ممتاز بناتی ہے، وہ "دین حنیف" کی خصوصیت ہے۔ مہذب دنیا کو مسلمان دارالاسلام کہتے ہیں۔ دارالاسلام میں وہ تمام سرزمینیں شامل ہوتی ہیں جہاں پر اسلامی شریعت کا رواج ہو اور ایک طرح سے اسلامی حکومت حاکم ہو۔ ان سرزمینوں کو دارالحرب نے ہر طرف سے گھیر رکھا ہے۔ دارالحرب اُن کافروں کی رہائش اور آبادی ہے جو ابھی تک اسلام قبول نہیں کر سکے ہیں اور انہوں نے اسلامی حکومت کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کیا ہے"۔[1]

اسی طرح لوئیس آگے لکھتا ہے:

> "گذشتہ کئی صدیوں کے دوران، مسلمانوں کو اس تاریخی عقیدے کی عادت ہو چکی ہے کہ انہی مذہب حق پر ہے اور دوسرے انسانوں کو اس کی پیش کش کرنا ان کا مقدس فریضہ ہے۔ زمین پر امت مسلمہ کی تشکیل کو مسلمان خدا کی مرضی تصور کرتے

۱۔ لوئیس، برنارد، خاور میانہ دو ہزار سال تاریخ از ظہور مسیحیت تا امروز، ترجمہ حسن کامشاد، ص ۲۷۷

ہیں اور ان کا عقیدہ ہے کہ اسلامی حکومت اور ہمسایہ کافروں کے درمیان ایک مستقل اور ضروری حالت جنگ برقرار ہے۔ایسی جنگ جس کا خاتمہ صرف کفر پر دین اسلام کی ناگزیر فتح اور پوری دنیا کا دارالاسلام میں داخل ہونے سے ہوگی۔"[1]

لوئیس نے تو اپنی تازہ ترین تحقیقات میں اسلام اور مغرب کے درمیان تصادم کے بارے میں ہنٹنگٹن کے خیالات کو تقویت بخشی ہے اور اس شعبے میں ہنٹنگٹن سے بھی آگے نکلتا ہوا نظر آتا ہے۔ایک مضمون میں لوئیس لکھتا ہے:

"عالم اسلام میں مغربی تہذیب کے داخل ہونے کی ابتدا سے لیکر اب تک، مغربی اثر ورسوخ کی سب سے زیادہ اور منظم مخالفت وہاں کی اسلامی فطرت نے کی ہے۔ مسلمانوں کو ہمیشہ غیر ملکی افراد کے ذریعہ اپنے ملک کے نظم و نسق کے چھین جانے سے کہیں زیادہ فکر کافروں کے ہاتھوں اپنے ایمان کو کھو دینے کی تھی۔ عالم اسلام کے ساتھ مغربی دنیا کا دیرینہ تقابل، بیداری، محاذ آرائی، تصادم اور انکار کے مختلف مراحل سے گزر رہا ہے، اگرچہ فی الحال صورتحال ماضی کے بنسبت بہتر ہوئی ہے لیکن ابھی بھی عالم اسلام اور مغربی دنیا کے بیچ تعلقات میں شدید عدم اعتماد اور گہری دشمنی پائی جاتی ہے، لہٰذا ان دو عظیم تہذیبوں کے مابین تعلقات کے سلسلے میں مروجہ ماحول کو بہتر طور پر سمجھنے کے لئے، اس کی تحلیل "تہذیبوں کا تصادم" کے تناظر میں ہونی چاہئے، نہ کہ اقوام اور ریاستوں کے مابین تنازعہ کی شکل میں۔"[2]

لوئیس کا ماننا ہے کہ جنگ سرد کے اختتام اور کمیونزم کے زوال کے بعد مغرب میں ایک نئے "زیر اثر" پیدا کرنے کی ضرورت نے مغرب کے لئے اسلام کے خطرے کو اور زیادہ اجاگر کر دیا۔اس سے یہ تصور پیدا ہوا کہ سیاسی اسلام کا رواج ایک نئی جنگ سرد کا آغاز ہے جو کہ "جمہوری مغربی دنیا" کو "اسلامی بنیاد پرستی" کے مقابل میں کھڑا کرتا ہے۔

۱۔ خاور میانہ دوہزار سال تاریخ از ظہور مسیحیت تا امروز، ص ۳۱۴

۲۔ نظریہ برخورد تمدن ہا: ہانتینگتن ومنتقدانش، ص ۳۰-۳۱

بہت سے لوگ اس دعوے سے متفق نہیں ہونگے کہ "تہذیبوں کا تصادم" کے نظریہ کا اصل بانی لوئیس ہے لیکن بلا شبہ لوئیس کے خیالات ہنٹنگٹن کے نظریات سے بہت قریب ہیں اور اس سے مطابقت رکھتے ہیں۔ اگرچہ ۹۰ کی دہائی میں اس نظرئے پر بہت سی علمی تنقیدیں ہوئیں اور اکیڈمک محافل میں اس کو نظر انداز کیا گیا لیکن ۲۱ صدی کی ابتدا سے ہی، خاص کر گیارہ ستمبر کے واقعات اور اس کے بعد بننے والے جذباتی ماحول نے ان پیچیدہ واقعات کے تجزیے کے لئے ایک مفہومی حوالہ پیدا کر دیا جس کے لئے کوئی جواز یا وضاحت موجود نہیں تھی۔

گیارہ ستمبر کے حوادث کے بعد کے دنوں اور مہینوں کے دوران، لوئیس کا نام منظر عام پر آگیا اور اسے ٹیلیویژن انٹرویو میں باقاعدگی سے مدعو کیا جانے لگا اور اتنا ہو گیا کہ پریس والوں نے لوئیس کو میڈیا اسٹار کا خطاب تک دے دیا اور تھوڑے ہی عرصے میں، لوئیس کئی مقالات شائع کرنے میں کامیاب رہا، یہاں تک کہ اس نے اپنی نئی کتاب کو بھی شائع کر دیا جو کہ اس کے مشہور مقالے "مسلمانوں کے غضب کی بنیاد" کی تکمیل و تشریح تصور کی جاتی ہے۔

عالم اسلام اور مغربی دنیا کے بیچ خصمانہ تعلقات کا تجزیہ کرتے ہوئے، برنارڈ لوئیس نے اس مسئلہ کے اصل تنازع یعنی عرب اسرائیل تنازع کو چھوڑ دیا ہے اور اُس کی جگہ پر دوسرے تنازع خیز مسائل کو اٹھایا ہے: مشرق وسطیٰ میں مذہب کو سیاست سے الگ کرنے کے عمل میں ناکامی، جدیدیت اور جمہوریت کے ساتھ اسلام کی عدم مطابقت، ایک کے بعد ایک فوجی شکستوں سے حقارت کا احساس اور سب سے اہم بات یہ کہ کھوئی ہوئی تہذیب کی یاد سے پیدا ہونے والی ناراضگی۔

لوئیس ابتدائی صدیوں میں اسلامی تہذیب کی ترقی اور مغربی دنیا کی پسماندگی کو تسلیم کرتا ہے لیکن اس کے خیال میں آگے چل کر تاریخ کا رخ بدل گیا۔ مغربی ممالک نے سائنس اور ٹکنالوجی میں نمایاں پیشرفت حاصل کی اور وہیں اسلامی ممالک فکری، معاشی اور سیاسی جمود کے دور میں داخل ہو گئے۔ اس صورتحال نے احساس کمتری، حسد اور ڈر کے احساس کے ساتھ مل کر مغربی دنیا کو اسلام پسندی کا مخالف بنا دیا۔

ایڈورڈ سعید نے لوئیس کی تنقیدی شخصیت اور اس کے علمی سطح پر تبصرہ کرتے ہوئے، مغرب میں لوئیس کے نظریات کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"لوئیس ایک ایسی دلچسپ چیز ہے جس کا مخصوص تجزیہ اور تحلیل کیا جانا چاہئے کیونکہ اسلام اور مغرب کے مسائل میں اس کا مقام و مرتبہ جید محقق اور مقتدر صاحب نظر کا ہے، اس طرح سے کہ اس شعبے میں وہ جو کچھ بھی لکھتا ہے اسے فوراً قبول کر لیا جاتا ہے۔ پھر بھی اس کی حالیہ تحریر اب تک کی سب سے بکواس اور رسوائیوں کے مجموعے کے سوا کچھ نہیں جس کو وہ مستشرقیت کی شعبے میں علمی تحقیق کا نام دیتا ہے"۔[1]

یہ بات یقینی ہے کہ برنارڈ لوئیس نے اسلام دشمنی اور اسلام کے سلسلے میں عجیب اور بے بنیاد دعوے کرنے کی ساری حدیں پار کر دی ہیں۔ مثال کے طور پر، اس کا یہ مضحکہ خیز دعویٰ ہے کہ "اسلام ایک غیر معقول اور بچھڑے ہوئے خیالات کا مجموعہ ہے جو غیر معقول جذبات، جبلت اور خیالات کے ذریعہ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد پر حکومت کرتا ہے"۔ یہ اس کے بے بنیاد اظہارات کی ایک مثال ہے لہٰذا اگر ہم اسلام کے ساتھ لوئیس کے طرز تعامل کی بنیاد پر لوئیس کی نظریہ سے ایک بیدار، منصفانہ اور واضح نتیجے تک پہنچنا چاہیں، تو ہم ہر گز کسی مطمئن نتیجے تک نہیں پہنچ سکتے۔ لوئیس اپنے کاموں میں قیاس لگانا اور رائے تجویز کرنے کے ساتھ ساتھ، قارئین کے ذہن میں رفتہ رفتہ اپنی بات اتارنے پر زور دیتا ہے۔

اسلاموفوبیا اور تہذیبوں کا تصادم:

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہنٹنگٹن اور لوئیس ہی معاصر اسلاموفوبیا کے اصلی نظریہ پرداز مفکر اور اس کے علم بردار ہیں۔ ان لوگوں نے عین اسی ذہنیت، تصورات اور حاکمانہ نظریات کو بظاہر تحقیق اور تجزیہ کی شکل میں دوبارہ پیش کیا جو پچھلی کئی صدیوں سے مستشرقیت پر حاوی تھیں۔ مثال کے طور پر، اپنی ابتدائی تحریروں میں، لوئیس مسلمانوں اور کمیونسٹوں کا موازنہ کرتے ہوئے کہتا ہے:

"دونوں گروہ مسلکی اجارہ داری اور مطلق العنانیت کے مسئلے کی تلاش میں ہیں اور یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کے پاس تمام زمینی اور ماورائی سوالات کا قطعی جواب موجود ہے۔"

اسی طرح ہنٹنگٹن بھی اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتا ہے: "اسلامی تعلیمات میں صلح اور امن پسندی کے مفہوم کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔"

۱۔ سعید ادوارد، شرق شناسی، ترجمہ عبدالرحیم گواہی، ص ۵۶۴

دونوں مفکرین پوری طرح سے متعصبانہ اور سبھی کو ایک نظر سے دیکھنے والی سوچ کی مدد سے یہ کوشش کر رہے ہیں کہ پوری دنیا کے تمام ۱٫۵ عرب مسلمانوں کی آبادی کو بلا کسی تمیز و فرق کے وحشی، غضب ناک، بے عقل، بے منطق اور سب سے اہم مغربی دنیا کے امن کے لئے سب سے بڑا خطرہ ثابت کر دیں، یعنی مستشرقیت کے یہ وہی متعصب نظریات ہیں اور یہی وہ مقام ہے جہاں پر مستشرقیت اور تہذیبی محاذ آرائی کے دائرے ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں۔ مختصر یہ کہ ان دو مفکرین کی تصنیفات اور بیانات، ۱۹۹۰ کی دہائی سے لے کر آج تک، معاصر اسلاموفوبیا کے اصول اور نظریاتی بنیاد کے طور پر پیش کئے جاتے ہیں اور انہیں کی طرف استناد اور رجوع کیا جاتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ لوئیس اور ہنٹنگٹن نے "تہذیبوں کا تصادم" کے نظریے کو پیش کر کے، مستشرقیت کے بنیادی اور پرانے دعوے، "مغربی دنیا کی برتری اور عالم کو مہذب بنانے کا اس کا مشن" کا ایک نئے ثقافتی بحث سے تعارف کرایا جس کو "اسلاموفوبیا" کا نام دے کر اس کے حوالے سے میڈیا میں ایک نئی جنگ کا آغاز کر دیا۔ خاص کر کے یہ تبدیلی اور بدلاؤ گیارہ ستمبر کے حوادث کے بعد میڈیا کے ذریعے بار بار ان کے نظریات اور خیالات کو پیش کرنے سے آئی۔ گیارہ ستمبر اور اس کے جیسے بعد کے واقعات پر تحلیل و تبصرہ کرنے کے لیے امریکہ کی اول درجے کی میڈیا نے ایک ساتھ براہ راست اور بالواسطہ حوالہ کے ساتھ اس نظریہ کو اپنی بنیاد بنایا۔

نتیجتاً اسلامی تعلیمات اور اسلامی معاشرے کی صورتحال کے بارے میں میڈیا کی لاعلمی اور جہالت نے معاشرے میں اس نظریاتی دائرے کو فروغ دیا اور اسی نظریہ کو اساس اور بنیاد بنا کر مختلف سیاسی اور سماجی واقعات کا تجزیہ کیا گیا جس سے "اسلام اور مغرب کے بیچ طرز تقابل" کو اور تقویت حاصل ہوئی۔ میڈیا کے ذریعے بنائے ہوئے اس ماحول نے مغرب میں رہنے والے عام لوگوں سے لے کر، علمی مفکرین و سائنسدانوں، عہدیداروں اور سیاسی تجزیہ نگاروں تک کو مجبور کر دیا کہ وہ ان دو عظیم تہذیبوں یعنی اسلام اور مغرب کے ماضی یا حال کے تعلقات کی جب بھی تفسیر و تشریح کریں تو وہ ہمیشہ تنازعات، تصادم اور تقابل کے تناظر میں ہی کریں۔ اگرچہ اس قسم کے معاندانہ رویہ اور ناراضگی کی بھی لمبی تاریخ ہے لیکن معاشرے کی مختلف سطوح پر اس کی شدت، عمق اور وسعت یقیناً بے مثال ہے۔ امریکی میڈیا میں گیارہ ستمبر اور اس کے نتیجے میں ہونے والے واقعات کو پیش کرنے کے طریقے پر ایک سرسری نظر، ہمیں اس نظریہ کی

مقبولیت کا اندازہ کرا سکتی ہے اور اس نظریہ کو خلق کرکے پیش کرنے والوں کی کامیابی کی گواہی دیتی ہے۔ میڈیا نے مختلف صورتوں سے اس حادثے کو مغربی دنیا کے ساتھ تہذیبی اور ثقافتی تصادم کی شکل دے کر اس کو "دوسروں" کی طرف سے بہت بڑا خطرہ بتایا۔

لہٰذا جس "تہذیبوں کا تصادم" کے نظریہ کو نوّے (۱۹۹۰) کی دہائی میں بے بنیاد فرضیات اور غیر مستند تاریخی و سیاسی حوالہ جات کی وجہ سے علمی محافل میں رد کر دیا گیا تھا، اسی نظریہ کو اکیسویں صدی کے آغاز سے ہی میڈیا کی مدد سے ایک ایسے برجستہ اور واضح نمونے میں تبدیل کر دیا گیا جس میں مشرق وسطی اور عالم اسلام کے تمام ثقافتی، معاشرتی، سیاسی اور معاشی واقعات کی وضاحت اور تشریح کرنے کی صلاحیت ہے۔ امریکہ کی اول درجے کی میڈیا جیسے نیویارک ٹائمز، واشنگٹن پوسٹ اور وال اسٹریٹ جرنل نے اس پیراڈائم کو فروغ دینے اور مستحکم کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ اس دعوے کا اثبات گیارہ ستمبر کے بعد نیویارک ٹائمز میں شائع ہونے والی یہ اسلام مخالف سرخیاں کرتی ہیں: "جی مسألہ اسلام ہے"، "ایمان بجبر"، "اسلامی تشدد کی گہری فکری جڑیں"، "اسلام اور سیاست کا سنگم"، "ایمان اور سکولر حکومت"، "اسلام نے کس طرح علم کی دنیا پر قبضہ کیا اور پھر اس کو کھو دیا"، "دو نظریہ: کیا قرآن تشدد کو فروغ دیتا ہے" وغیرہ۔

نیویارک ٹائمز نے ہمیشہ عالم اسلام کو منفی خصوصیات اور عنوانات کے ساتھ پیش کیا ہے: "جمہوریت کا فقدان، تعلیمی سہولیات کی کمی، آبادی میں بے تحاشا اضافہ، بے روزگاری اور معاشی کساد بازاری، شہادت اور نوجوانوں میں خودکش کارروائیوں کی خواہش، خواتین کی کم حیثیت وغیرہ"۔ امریکا کے دیگر بڑے میڈیا سروسز نے بھی پوری کوشش کی کہ وہ اس قافلے سے پیچھے نہ رہ جائیں۔ مثال کے طور پر، وال اسٹریٹ جرنل، امریکہ کے سب سے زیادہ مؤثر اخبار نے گیارہ ستمبر کے حوادث کے بعد باقاعدہ اور برجستہ طور پر ایسی اور اس جیسی دوسری سرخیوں کا استعمال کیا:

> "بربریت اور تشدد پرستی کی ثقافت نے جنگ کا اعلان کر دیا ہے۔ یہ اعلان ہماری پالیسیوں کی وجہ سے نہیں ہے، بلکہ ان اقدار کی وجہ سے ہے جن کے لئے ہم کھڑے ہوئے ہیں: جمہوریت اور آزادی۔"

تہذیبوں کے تصادم کے اثرات اور نتائج:

اسلاموفوبیا اور مسلمانوں کی غلط شبیہ سازی دور حاضر کے بعض واقعات اور "تہذیبوں کا تصادم" کے نظریہ کی وجہ سے اگرچہ بہت محبوب ہوگئے ہیں، لیکن ہر منفی آئیڈیالوجی کی طرح اس کے بھی معاشرہ پر غلط اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ پوری دنیا میں، مغرب تا مشرق اور شمال تا جنوب، روز بروز مسلمانوں کے خلاف نسلی منافرت میں اضافہ ہوا ہے۔ اس المیہ کی گہرائی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اٹلی کے سابق وزیر اعظم سلویو برلسکونی "اسلامی تہذیب پر مغربی تہذیب کی برتری" کے بارے میں پورے تکبر کے ساتھ اور واضح طور پر زبان کھولنے کی جرات کرتا ہے اور اٹلی کے صحافی اور یانا فالسی ایسا سخیف اور مضحکہ خیز بیان دیتا ہے: "میں ان (دہشت گردوں) کو ایسے لوگوں جیسا سمجھتا ہوں جو صرف دکھاوے کی تلاش میں ہیں اور کچھ نہیں۔"

این کالٹر مشہور صحافی نے ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ کو لکھا: "ہمیں تمام اسلامی ممالک پر حملہ کرنا چاہئے، ان کے رہنماؤں کو قتل کر دینا چاہئے اور ان کی قوم کو عیسائی بنانا چاہئے۔" اس دور کا انتہائی تباہ کن اور اشتعال انگیز بیان امریکی صدر جارج ڈبلیو بش کا بیان تھا۔ امریکہ کے اس وقت کے صدر نے دہشت گردی کے خلاف جنگ کو ایک اور صلیبی جنگ کے آغاز سے تعبیر کیا تھا۔ ایک ایسی تعبیر جس نے دنیا بھر کے بہت سے مسلمانوں کو مشتعل کر دیا۔

برلسکونی، فلاچی اور ان جیسوں کے بیانات کی وجہ "اسلامی تعلیمات، مغرب کے ساتھ اسلامی تعلقات کے تاریخی پس منظر، عالم اسلام کی موجودہ حالت اور دہشت گرد گروہوں کی نوعیت سے ان کی لاعلمی، میڈیا اور نجی ذرائع پر ان کا انحصار اور کچھ معاملات میں ان کی خود کی شرارت اور تکبر" کو قرار دیا جاسکتا ہے، لیکن زیادہ اہم اور قابل غور بات یہ ہے کہ ایسے خیالات کے اظہار کی اصل وجہ "تہذیبوں کا تصادم" جیسے بعض سیاسی اور علمی نظریات ہوتے ہیں اور اس طرح کے نظریات مسلسل دیکھے اور پڑھے جاتے ہیں اور استناد کیے جاتے ہیں۔

مجموعی طور پر، تہذیبوں کے تصادم کے نظریہ نے دنیا کے تمام ممالک خصوصا مغربی اقوام میں تمام مسلمانوں کے خلاف نسل پرستی کی لہر پیدا کرنے میں مدد کی ہے اور اس کا جواز پیش کیا ہے لیکن اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ اس نظریہ کی وجہ سے مغربی عوام کی رائے عامہ پر منفی اثرات مرتب ہوئے ہیں لہٰذا یہ

بات قابل غور ہے کہ "تہذیبوں کا تصادم" جیسے نظریات میں علم کلام کے واضح ضعف کے باوجود، اس کو اسلام سے متعلق مختلف امور پر تجزیے اور تحلیل کے لئے استعمال کیا جاتا ہے اور اس پر استناد کرنے والوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا جارہا ہے۔

اس مسئلہ اور موضوع کا تعلق علمی جواز و صحت اور تجزیاتی و وضاحتی نظریات سے نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق ماحول کے تقاضوں اور حالات سے فائدہ اٹھا کر اس کو اپنے دعوؤں کے اثبات میں استعمال کرنے سے ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ کرسچن سائنس مانیٹر اخبار کا ایک مشہور صحافی طنزیہ انداز میں کہتا ہے: امریکی عوام، "صحیح معلومات" کی اس وسیع مقدار میں فراہمی کے بعد، اب "طالبان اور شاہراہوں" کے مابین فرق کو آسانی سے پہچان سمجھ سکتے ہیں لیکن وہ اب بھی واقعات کے مجموعے کو ایک سادہ اور قابل فہم دائرے کی شکل میں سمجھنے سے قاصر ہیں۔

تہذیبوں کے تصادم پر مبنی اسلاموفوبیا کی تحقیقات

تہذیبی تصادم کا نظریہ اسلام اور مسلمانوں سے متعلق تحقیقات میں بڑے پیمانے پر استعمال ہوا ہے۔ مثال کے طور پر آواس "امریکی میڈیا میں اسلام کی تصویر کشی" کے موضوع پر تحقیق کرکے اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ امریکی میڈیا مکمل طور پر اور باقاعدگی سے، اسلام کو مغربی سلامتی کے لئے خطرہ قرار دیتا ہے۔ اس کے نزدیک، اسلام "بنیاد پرستی" اور "دہشت گردی" کے مترادف ہے۔ اگرچہ اس تحقیق میں تہذیبوں کے تصادم کے نظریہ کا براہ راست ذکر نہیں کیا گیا ہے، لیکن اس کے اصلی نکات و اصول کی عکاسی اس کے نتائج میں نظر آتی ہے۔

مرے اور آنکن بھی یہی سمجھاتے ہیں کہ مغربی میڈیا کس طرح سے اپنے مقالوں میں تہذیبی تصادم کے نظرئے کا استعمال کرکے اس سے فائدے اٹھاتا ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ "تہذیبوں کے تصادم" پر مبنی نظریات، اسلام اور مغرب کے مابین تنازعہ کو ناگزیر بنادیتے ہیں اور انہوں نے اپنے دعوے کو ثابت کرنے کے لئے مختلف میڈیا ہاؤسز کی کارکردگی کی مثالیں بھی پیش کی ہیں۔ رین اور اس کے ساتھیوں کی نئی تحقیق، اُن تحقیقات میں سے ہے جس میں اس نظریہ کو اپنا مفہومی بنیاد قرار دیا گیا ہے۔ لہٰذا تہذیبوں کے تصادم کے نظریہ کی بہترین شکل میں تعریف کے لئے ہم کو وہی ابتدائی اور مشہور دوہرے زمرہ بندی کو سمجھنا ہوگا جس میں "ہم" مقابل "وہ"، "مہذب" بمقابل "بربر" یا "مغربی" بمقابل "غیر مغربی" کی سوچ

ہوتی ہے۔ ایک ایسی سوچ جو مستشرقیت کی بنیاد اور اس کی مشتق سمجھی جاتی ہے۔ مستشرقیت کے کلام میں اسلام (مشرق) کو منظّم طریقے سے مغرب سے الگ کر دیا گیا ہے اور پھر اسی کی وضاحت کرتے ہوئے مغرب کو ایک سنجیدہ، معقول اور ترقی یافتہ کے طور پر بتایا جاتا ہے اور اس کے برعکس مشرق (خاص طور پر اسلام) کو ایک غیر معقول اور منحرف، بربر، فرسودہ اور مایوس کن تہذیب کے طور پر متعارف کرایا جاتا ہے۔ سعید کی تعبیر کے مطابق ایک طرف مغربی دنیا کے افراد ہیں اور دوسری طرف مشرق کے عرب لوگ ہیں۔ پہلا گروہ نہایت معقول، پرامن، عاقل اور اپنے حقیقی اقدار کا تحفظ کرنے والا ہے، وہیں دوسرے گروہ میں ان اوصاف کی کوئی ایک بھی چیز نہیں پائی جاتی۔

تہذیبوں کے تصادم کے نظریہ کی تنقید

آج تہذیبوں کے تصادم کا نظریہ نہ صرف ایک عام اور مرسوم نظریہ بن گیا ہے، بلکہ مغربی عوام کی ایک بڑی فیصد نے اسے معاشرتی اور ثقافتی حقیقت کے طور پر قبول کیا ہے لیکن اس کے باوجود بعض محققین کا ماننا ہے کہ: ہنٹنگٹن کے نظرئے کی دھماکہ خیز مقبولیت کی وجہ اس کا مواد نہیں ہے بلکہ اس کی وجہ معاصر علوم سیاسی میں مفاہیم کی کمی اور کمزوری اور جنگ سرد کے اختتام کے بعد متضاد واقعات کا تجزیہ نہ کر سکنے کی ان کی عدم صلاحیت ہے۔ ہنٹنگٹن کی ذہانت اس کے سیاسی افکار کی صلاحیت میں نہیں بلکہ اس کی ہوشیاری اور موقع کی صحیح سمجھ میں ہے۔ اس کے علاوہ، اس کے نظریات کے اتنے خریدار ہونے کی وجہ، امریکی اور مغربی عوام کے خیالات کا محاصرہ اور ان میں اجنبیوں کا شدت کے ساتھ خوف پیدا کرنا تھا۔

دوسرے الفاظ میں، اس نظریہ کی تعمیر اور مقبولیت میں دو عوامل کا تعاون ہے۔ پہلا وہ نظریاتی خلا جو بین الاقوامی تعلقات کے مطالعاتی علوم میں موجود ہے، اور اسی کے ساتھ مشرق و مغرب کے سیاسی تعلقات پر تحلیل کے لئے ماہرین کا پرانے پیراڈائمز کی طرف رجوع کرنا اور دوسرا عوام کے دلوں میں اجنبیوں کا خوف پیدا کرنا۔ یروندابراہیمیان نے اس نظریہ کی کامیابی کے لئے درج ذیل تین اہم عوامل کو بتایا ہے:

۱۔ امریکہ دنیا کے (نام نہاد) مہذب خطوں میں خصوصا یورپ میں اپنی بالادستی اور برتری برقرار رکھنا چاہتا ہے۔

۲۔ ہنٹنگٹن کا نظریہ صحافیوں اور اس کے دیگر سامعین کے لئے مسائل کو سمجھنے میں آسانی فراہم کرتا ہے کیونکہ اب مشرق وسطی کی سیاست اور عالم اسلام (جس میں شمالی افریقہ کے مراکش سے لیکر جنوبی

ایشیا میں انڈونیشیاتک کی نسلیں، ثقافتیں اور قومیں شامل ہیں) کی ناقابل بیان تشریحات پیش کرنے کے بجائے، ایک عمومی نظریاتی دائرہ جو سب کے لئے قابل فہم ہے پر اکتفا کیا گیا ہے اور وہ خود کو تکلیف دہ اور پریشان کن تفصیلات کے دلدل میں نہیں ڈالتے۔ اس کے نتیجے میں، ان حقائق کو آسانی سے نظرانداز کر دیا جاتا ہے۔ ہنٹنگٹن کا نظریہ جو تہذیب کے اندر آپسی تعلقات، تہذیبوں کے بیچ تصادم اور دین کے اہم کردار پر زور دیتا ہے، وہی نظریہ ایران کا ایک مسلمان ملک کی حیثیت سے چیچن کے بجائے روس کی حمایت، آذربائیجان کے بجائے آرمینیا کی حمایت اور پاکستان کے بجائے ہندوستان کی حمایت کو کس طرح سمجھائے گا اور اس کا جواز دے گا؟ لہٰذا شاید ہی کوئی صحافی ہو جو ایسی چیزوں کا مطالعہ اور عمیق تحلیل کرکے خود کو زحمت میں ڈالے اور اپنے قارئین کو بھی الجھا کے رکھے۔

۳۔ اس کی بنیادی وجہ (ابراہیمیان کی نظر میں)، اس حقیقت میں چھپی ہوئی ہے کہ ہنٹنگٹن نے عالم اسلام سے متعلق سیاسی حقائق، خاص طور پر عرب اسرائیل تنازعہ پر غور کیے بغیر، بین الاقوامی سیاست کا تجزیہ کیا ہے۔ اسرائیل اور فلسطین کا مسئلہ در حقیقت، ایک سرخ لکیر ہے جس سے عبور کرنے کی اجازت کسی کو نہیں ہے۔ امریکی میڈیا اور سیاست دانوں نے ہنٹنگٹن کے اس نظریہ کی تائید وترویج بھی بالکل اسی وجہ سے کی ہے، یعنی بین الاقوامی سیاست اور تعلقات میں اسرائیلی سیاست کے کردار کو نظرانداز کرنا۔ مشرق وسطی میں عرب اسرائیل تنازعہ، خطہ میں امریکہ کی عدم مقبولیت اور امریکہ کے مخالف دہشت گردی کے جنم لینے جیسے مسائل کا صریح طور پر انکار بھی بوش انتظامیہ نے اسی سلسلے میں کیا تھا۔ اس طرح، یہ مان لینا کہ یہ معاملات ایک دوسرے سے متعلق ہیں، ایک طرح سے انہیں سرخ لکیروں کو عبور کرنا ہے جو کہ ناقابل معافی غلطی تھی۔ مختصر یہ کہ ہنٹنگٹن نے اصل مسائل کی طرف سے توجہات کو ہٹا کر، بین الاقوامی تعلقات کو اس انداز سے پیش کیا جو اصل سیاسی حقائق سے عاری تھا اسی وجہ سے اس کے نظریہ کو وسیع پیمانے پر قبول کیا گیا تھا۔

اس نظریہ میں کچھ اہم اور قابل غور نکات ہونے کے باوجود، اس کی مضبوط علمی اور نظریاتی اساس وبنیاد نہیں ہے اور بہت سے تاریخی حقائق کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتا ہے۔ ضرورت سے زیادہ سادگی، موٹی موٹی باتوں کا تذکرہ، تاریخی واقعات کی غلط تشریح نیز حقائق میں سے متعصبانہ انتخاب، اس نظریہ کی

صرف کچھ واضح خامیاں ہیں۔ کروکر اور روبنسٹائن، جنہوں نے "بشر کی ضروریات کی تکمیل" کے نظریہ کو پیش کیا ہے، مذکورہ نکات میں سے آخری والے کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "ہنٹنگٹن اپنے نظریے کی توثیق کرنے کے لئے بہت سے نسلی۔ قومی تنازعات جو اس وقت جاری ہیں، ان میں سے اس تنازعہ کا انتخاب کیا جہاں بظاہر ایک تہذیب بمقابل دوسری تہذیب نظر آتی ہے لیکن اس کے اس انتخاب کو دوسرے موارد سے موازنہ نہیں کیا جاسکتا ہے۔"[1]

اس کے علاوہ، اس کے مقالے میں ایسی پیشینگوئیاں موجود ہیں کہ اگر ان سب کو ایک سیاسی اصول اور پالیسی کے طور پر منتخب کیا جائے تو آسانی سے "خود مطمئن پیشینگوئی" میں تبدیل ہو سکتی ہیں۔

فاکس، پیپڈ، اور میسز وڈا، ہنٹنگٹن کے نظریہ میں بعض اشکالات کی نشاندہی کرتے ہوئے، یہ مانتے ہیں کہ ہنٹنگٹن نے تہذیب کی ایک بہت وسیع اور مبہم تعریف پیش کی ہے اور اس تعریف میں مختلف تہذیبوں کے بیچ فرق کرنے والے حدود بھی واضح نہیں ہیں۔ اسی طرح مغربی اور اسلامی تہذیبوں کو بالکل متحد تصور کرنا، نیز امریکی اور یوروپی تہذیبوں کے بیچ موجود گہری نا اتفاقیوں (۲۰۰۳ میں عراق جنگ کے بارے میں فرانس اور امریکہ کے مابین زبردست تنازعہ کی طرح) پر غور کئے بغیر ان کو بالکل ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ جلوہ دینے کی کوشش بھی فاکس، پیپڈ، اور میسز وڈا کے نقد کے موضوع رہے ہیں۔ اور سب سے اہم، اس نظریے کی سب سے بنیادی کمزوری اسلامی اور کنفیوشین تہذیبوں کو آپس میں مربوط جلوہ دینا ہے، جس پر ہنٹنگٹن نے بغیر کسی واضح وجہ کے زور دیا ہے۔

مختصر یہ کہ ہنٹنگٹن کا تہذیبوں کا تصادم کا نظریہ واضح فکری غلطیوں پر مشتمل ہے اور مستند دلائل کے فقدان کے ساتھ ساتھ یہ کمزور تاریخی شواہد پر بھی مبنی ہے۔ تہذیبوں کو حد سے زیادہ اہمیت دینا اور پھر "قوم و حکومت" کی جگہ پر لفظ تہذیب کا استعمال کرکے اس کا بین الاقوامی تعلقات میں موثر کردار بتانا، دوسری جنگ عظیم کے بعد کے حالات کے لئے جنگ سرد کو یقینی طور پر ذمہ دار سمجھنا، ثقافت اور تہذیب کے وجود کو برابر کرنا، تحلیل اور تجزیہ کے تحت موضوعات کی ایک کلی اور عمومی حیثیت، اور آخر کار اسلامی اور

۱۔ روینشتاین، ریچارد و چارل کروکر، چالش با ہانتینگتن در نظریہ برخورد تمدن ہا: ہانتینگتن ومنتقدانش، ترجمہ مجتبی امیری وحید

عیسائی تہذیب کے مابین تعاون کے امکان کو کالعدم قرار دینا، اس نظریے میں موجود قابل غور متنازعات ہیں۔ اسی حصے کے تسلسل میں ہم ہنٹنگٹن کے نظریے پر وارد کچھ دیگر اہم تنقیدات کا ذکر کریں گے:

ہنٹنگٹن نے "تہذیب" کا جو تصور پیش کیا ہے، اس پر بھی بہت تنقید کی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس نے تہذیب کا غلط تصور پیش کرکے لوگوں کو غلط فہمی میں ڈال دیا ہے۔ اس نے تہذیب و ثقافت کی کوئی علمی تعریف پیش کئے بغیر ان دونوں کے درمیان قریب ترین رابطے پر زور دیا ہے اور ان دونوں مفہوم کے بیچ مخفی رابطہ ہونے کا قائل ہے، جب کہ علم ثقافت کے ماہرین اور تہذیب دانوں کے مطابق، ان میں مشترک معنی اور ہم آہنگی ہونے کے باوجود تہذیب و ثقافت کے درمیان اہم فرق بھی موجود ہے جس کو ہنٹنگٹن نے پوری طرح سے نظرانداز کر دیا ہے۔

بعض ماہر بشریات اور معاشرتی مورخین جو ثقافتی علوم کے علمبردار ہیں، ان کے نظریے کہ مطابق ہنٹنگٹن کو اس وقت ثقافت کی اہمیت کا احساس ہوا اور اس نے اس کی اہمیت کا دعوی کیا جب انھوں نے اس سے قبل ثقافت کو معاشرتی امور کے تجزیے میں ایک اہم تصور کے طور پر متعارف کرا دیا تھا لہٰذا ہنٹنگٹن کے نظریے کی مقبولیت بھی اسی قسم کے مطالعات کی مقروض ہے۔

دوسرا نکتہ یہ کہ ہنٹنگٹن نے جن تہذیبوں کی طرف اشارہ کیا ہے ان میں آپس میں کچھ بھی مشترک نہیں ہے۔ اس کی سات تہذیبوں میں سے تین (اسلام، ہندومت اور کنفیوشزم) دنیا کے مشہور مذاہب میں سے ہیں۔ دوسرا جاپان ہے جو اس فانوس کی مانند ہے جو ملک پر لٹک رہی ہے۔ ایک تہذیب کی تعریف بولی جانے والی زبان کی بنیاد پر کرتا ہے (لاطین امریکہ) تو دوسرا تہذیب کو جغرافیائی حدود کی بنیاد پر بتاتا ہے اور آخر میں مغربی تہذیب کو سورج کے حرکت کی بنیاد پر بتایا ہے۔

مجموعی طور پر ہنٹنگٹن کی طرف سے پیش کی گئی متعدد تہذیبوں میں سے چار، اس کے تہذیب کی تعریف کے مطابق ہی نہیں ہیں۔ مثال کے طور پر، مغربی تہذیب سے شروع ہونے والی لاطینی امریکی تہذیب کو کیوں مختلف ہونا چاہئے؟ یا کیوں روس کو مغربی تہذیب کا حصہ تصور نہیں کیا جاتا جب کہ وہ لوگ آرتھوڈوکس مذہبی عقائد اور لیننسٹ اور ٹالسٹائی (جو کہ مغربی تہذیب کا مظہر ہیں) کے خیالات سے متاثر ہیں۔ یہاں تک کہ ہنٹنگٹن، افریقی امریکیوں اور لاطینیوں کو، جو کہ تین صدیوں سے زیادہ عرصے سے اس ملک میں مقیم ہیں، مغربی تہذیب سے باہر سمجھتا ہے۔ اور زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ ہزاروں

سال پرانی روایت اور ورثہ کے ساتھ یہودی تہذیب کو ہنٹنگٹن نے اپنی تہذیب کی فہرست میں شامل نہیں کیا ہے۔

شاید ایک زیادہ اہم سوال یہ ہے کہ: تہذیبوں کے مابین تصادم اور تقابل کے نظریہ کے لئے کون سی دلائل پیش کی جاتی ہیں؟ کیونکہ ایک طرف، روایتی تہذیبوں میں بہت سے مشترکہ عناصر موجود ہیں اور ہنٹنگٹن کے خیالات کے برخلاف ان مشترکہ عناصر کی مقدار اس سے بڑھ کر ہے کہ تہذیبوں کے بیچ تفرقہ پیدا ہونے کی صورت پیش آئے لہٰذا، مختلف مذاہب کے درمیان بہت سے مشترکہ اصول موجود ہیں اور دوسری جانب تہذیب سے متعلق سب سے اہم بات ان کا آپس میں مقابلہ اور جدوجہد نہیں ہے، بلکہ ان کے اندرونی مشکلات اور تنازعات ہیں۔ جیسا کہ جارج ٹاؤن یونیورسٹی میں پروفیسر اور اقوام متحدہ میں سابق امریکی نمائندہ، جن کرک پیٹرک نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے کہ یہ واضح نہیں ہے کہ گذشتہ صدیوں کے دوران تہذیبوں کے درمیان پائے جانے والے اختلافات طویل ترین اور انتہائی پُر تشدد تنازعات کا باعث بنے ہیں بلکہ اس کے برعکس، بہت سارے اعداد و شمار موجود ہیں جو یہ بتاتے ہیں کہ امن اور آزادی کے معاہدے کے بعد سے ہونے والے اکثر تنازعات تہذیب کے اندرونی معاملات رہے ہیں۔ بیسویں صدی میں، ہم نے اس تشدد کی انتہا "اسٹالن کے خونی انتقام اور چیچنی لوگوں کے قتل عام" کی شکل میں دیکھا اور اس سے بھی بڑھ کر ہم پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے گواہ ہیں جس میں دس کروڑ سے زائد لوگ صرف تہذیبوں کے اندرونی تصادم کی وجہ سے مارے گئے۔ یہ وہ تاریخی واقعات و حوادث ہیں جن کو ہنٹنگٹن نے نظرانداز کر دیا۔

ایک اور نقطہ نظر سے، بیشتر ممتاز سیاسی دانشوروں نے ہنٹنگٹن پر الزام لگایا ہے کہ اس نے مستقبل میں بین الاقوامی تعلقات میں حکومت کی پوزیشن کو خراب بتایا ہے کیونکہ جنگ سرد کے اختتام کے بعد بھی بین الاقوامی سیاست میں اصل کردار حکومتوں کا ہوگا اور ان کے لئے ثقافتی مفادات کے بجائے قومی اور ملکی مفادات ہی سب کچھ ہوگا۔ مثال کے طور پر، جان ہاپکنز یونیورسٹی کے ممتاز پروفیسر اور مشرق وسطی امور کے ماہر، فواد عجمی، جرنل فارن پالیسی میں اپنا ایک مقالہ شائع کرتے ہیں جس میں ہنٹنگٹن کو تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے لکھتے ہیں: ہنٹنگٹن کو حکومت اور اس کے قومی مفادات کے میدان میں ایک با اثر کردار اور شخصیت تسلیم کیا جاتا تھا پھر کس طرح اس نے اپنے قومی مقاصد اور مفادات کو آگے بڑھانے میں حکومتوں

کے کردار کو نظرانداز کر دیا ہے۔ عجمی اس نظریہ کو ایک غلط اور عجیب نظریہ قرار دیتے ہیں کیونکہ ان کے خیال میں تہذیبوں کا حکومتوں پر قابو نہیں ہوتا بلکہ یہ حکومتیں ہوتی ہیں جو تہذیبوں پر قابو رکھتی ہیں اور حکم چلاتی ہیں۔ دیگر لوگ بھی اسی طرح کا خیال رکھتے ہوئے یہ مانتے ہیں کہ سیاست اب بھی قومی مفادات کے تصادم کی صورت میں بنتی ہے نہ کہ ثقافتی تصادم کی بنیاد پر۔

ہنٹنگٹن کے نظریے پر ایک اور تنقید، اسلام کے سلسلے میں اس کے سخت اور تعصب بھرے بیانات ہیں۔ اس کے مطابق اسلامی حدود اور سرحدیں خونی ہیں اور دوسری ثقافتوں اور تہذیبوں کے ساتھ اسلام کے تعلقات ہمیشہ سے خونریزی اور تشدد سے بھرے رہے ہیں۔ بنیادی سوال یہ ہے کہ یہ دعوی کس تاریخی دلیل کی بنیاد پر کیا جارہا ہے؟ اسلامی سرحدوں پر کون سے افراد اور گروہوں کا خون بہا ہے یا بہایا جاتا ہے؟ در حقیقت اس تشدد کا مرتکب کون ہے اور شکار کون ہے؟ کیا اس کے سوا کچھ ہے کہ ان تمام سرحدوں پر غیر مسلم نسل پرستوں کے حملوں کا شکار ہمیشہ مسلمان بنے؟ کیا فلپائن اور بوسنیا کے شہریوں کی خونریزی اور قتل عام میں مسلمان ملوث تھے؟ کیا ہندوستان، اسرائیل اور برما میں مسلمانوں کی اقلیت نے دہشت گردی، فساد اور تشدد کو شروع کیا؟

ہنٹنگٹن اسلام کو تشدد کے ساتھ جوڑتا ہے جب کہ گذشتہ برسوں میں ان تمام تنازعات میں جو مسلمانوں اور مغرب نواز طاقتوں کے مابین پیش آئے ہیں، ان سب میں ہمیشہ مسلمان گروہ چاہے وہ آذری ہوں یا فلسطینی، عراقی یا بوسنیائی، یہی لوگ ان تنازعات میں مغلوب ہوئے ہیں۔ اس کے بالعکس، کثرت سے معقول ثبوت ہونے کے باوجود مغرب کو جبر و تشدد سے پاک رکھنے کی ہنٹنگٹن کی کوشش مضحکہ خیز ہے۔ لیک فورسٹ شکاگو یونیورسٹی میں شعبہ معاشیات کے پروفیسر، ڈاکٹر صدری کے مطابق:

> " فاشزم، خود حکومتی اور زینوفوبیا ایسی بیماریاں ہیں جو تمام تہذیبوں کے لئے یکساں طور پر خطرہ بنی ہوئی ہیں (لیکن ایک ہی وقت میں اور ایک شدت سے نہیں)۔ یہ ایک ایسے کینسر کے مانند ہے جو مشرق - مغرب نہیں جانتا اور نہ ہی کوئی تہذیب اس طرح کے تشدد سے اب تک آزاد ہو سکی ہے لہٰذا اپنے تشدد کے معاملات کو دھیرے سے دبا کر سامنے والے کے تشدد کو گنواتے رہنا کوئی انصاف نہیں ہے۔"[۱]

۱۔ صدری، احمد، مصاف تمدن ہا خواب چپ سا موئل ہا تنیگتن در نظریہ برخورد تمدن ہا ہا تنیگتن ومنتقدانش، ترجمہ مجتبی امیری وحیدی، ص ۲۶۰

اس کے علاوہ، بہت سے مورخین اور مشرق وسطی کے ماہرین نے اسلام کے سلسلے میں ہنٹنگٹن کے علم و آگاہی کی شدت سے تنقید کی ہے۔ ان کے خیال میں، وہ جڑواں نامبی اور اسپنگلر کے الفاظ بتانے اور دہرانے کے سوا کچھ نہیں کر رہا ہے۔ ہنٹنگٹن ایک سیاسی محقق ہے جس نے جلد بازی اور غیر سنجیدگی سے ایک ایسے موضوع پر نظریہ پیش کیا ہے جس کی تاریخ کے بارے میں وہ تقریباً کچھ نہیں جانتا ہے۔ اسی طرح وہ ایک مثال کے ذریعے اسلام اور اس سے مرتبط موضوعات کے سلسلے میں ہنٹنگٹن کے علم پر اس طرح اپنی تردید ظاہر کرتا ہے: تہذیبوں کے تصادم کی نوعیت کے بارے میں اپنے مقالے اور اپنی کتابوں دونوں میں، اس نے اس واضح امتیاز سے اپنی لاعلمی کا ثبوت دیا ہے جو اسلام، اہل کتاب (اہل یہود اور عیسائی) اور کافروں اور مشرکوں کے درمیان قائل ہوا ہے۔

اور مختصر یہ کہ، تہذیبی تنازعہ کے پیراڈائم (اور نہ صرف ہنٹنگٹن کا نظریہ) خصوصاً اسلام کے حقائق کی وضاحت میں، سب سے اہم خامیوں کا خلاصہ اس طرح کیا جاسکتا ہے:

اسلام کے بارے میں ایک جامع، منطقی اور حقیقت پسندانہ نظریہ کا فقدان، ایک یورپ پسند، نسل پرستانہ اور سیکولر نقطہ نظر اپنانا اور اس کے نتیجے میں مسلمانوں کے بارے میں متعصبانہ اور غرضمندانہ اور مکمل طور پر منفی نظریہ، اسلامی ثقافت کو منجمد اور پچھڑا ہوا تصور کرنا، اسلام اور مغرب کی دشمنی کو ذاتی اور حقیقی دشمنی سمجھنا، عالم اسلام کو ایک پر تشدد، نا مساوی، عقلانیت اور عقل بشر سے دور سمجھتے ہوئے ذلت کی نگاہ سے دیکھنا اور اس کو ایسی تہذیب تصور کرنا جو مغربی ترقی اور جدیدیت کے تمام مظاہر کی مخالفت کرتا ہے، القاعدہ اور طالبان جیسے گروہوں کے خشک اور پیچیدہ نظریات اور ان کے متشدد اور وحشیانہ اقدامات کو پورے عالم اسلام سے وابستہ کرنا، اسلام اور مغرب کے مابین تہذیبی مذاکرات کے امکان نہ ہو پانے کی غلط سوچ اور ساتھ ساتھ ان دونوں تہذیبوں کے مابین پُر تشدد تنازعات کی ناگزیریت پر یقین، سیکولرزم پھیلانے کے لئے مشرق وسطی میں امریکہ اور مغربی ممالک کے منفی کردار اور ان کی مداخلت کے الزامات کا پوری طرح سے انکار کرنا، اسلامی معاشروں میں تشدد اور جنگ افروزی، عالم اسلام کے بد عنوان اور آمرانہ حکمرانوں کی حمایت، نو مذہبی اور اصلاح پسند دھاروں کی وسیع تحریکوں کو نظرانداز کرنا، اندرونی اور بیرونی تاریخی بنیادوں کو نظرانداز کرنا جو اس واقعہ کی موجودگی اور اس کی شدت کو متاثر کرتا ہے (ذاتی تقابل کے دعوے کرنے کی جگہ) اور آخر کار اپنے دعوے کو ثابت

کرنے کے لئے ضروری تجربیاتی ثبوت کا پیش نہ کرنا۔

لوئیس کے بیانات اور تالیفات میں مذکور دو نکات کے بارے میں، مختصر طور پر یہ بتانا ضروری ہے کہ اسلامی فقہ کے نقطہ نظر سے، دار الاسلام اور دار الحرب کے درمیان ایک وسیع و عریض علاقہ ہے، جہاں ایک خاص مذہب پر اعتقاد ہونے کے باوجود تمام منصف اور آزاد خیال اور حق طلب لوگ اس میں جگہ پاتے ہیں اور اسلام کبھی بھی ان کی خواہشات کے برخلاف انہیں دو خطوں میں سے کسی ایک کا حصہ بننے پر مجبور نہیں کرتا ہے۔ اور دوسرا نکتہ یہ ہے کہ، اسلامی نقطہ نظر سے، دیں حنیف میں ابراہیمی مذاہب (یہودیت، عیسائیت اور اسلام) کے درمیان تمام مشترکہ اصول اور اجزا شامل ہوتے ہیں۔

اسلامی مطالعات اور مستشرقیت کے میدان میں ماہر دو مفکرین نے ہنٹنگٹن کے نظریہ کی سخت تنقید کی ہے۔ اپنے مشہور مقالے "اسلامفوبیا پر نظر ثانی" میں فریڈ ھالیڈی لکھتے ہیں:

> "اگرچہ اچھا لگتا ہے لیکن غلط ہوگا اگر بغیر کسی ثبوت کے ہم معاصر اسلام مخالف جذبات کو مغرب اور اسلام کے درمیان تصادم اور تقابل کی ایک لمبی تاریخ سے جوڑ دیتے ہیں اور اس سے بھی برا یہ ہوگا کہ ہم مسلمانوں کے خلاف دشمنی اور خصومت کو جنگ سرد کے اختتام تک محدود کر دیں۔[1]

وہ اسلام اور مغرب کے تصورات سے جڑی سادہ سوچ اور سطحی نگاہ پر بھی تنقید کرتا ہے۔ ان کے مطابق، دونوں تصورات بہت مختلف اور وسیع ہیں۔ بلا شبہ پوری ماڈرن دنیا کے لئے لفظ "مغرب" کا عنوان استعمال کرنا غلط ہوگا اور بالکل اسی طرح ۵۰ ممالک اور ڈیڑھ ارب سے زیادہ افراد کا حوالہ دینے کے لئے لفظ "اسلام" کا استعمال کرنا بھی درست نہیں ہے لہٰذا، مغرب اور اسلام کے درمیان تعلقات کا تجزیہ کرتے ہوئے ہمیں دونوں تہذیبوں سے متعلق مختلف ممالک کے بیچ اہم اختلافات اور امتیازات پر غور کرنا چاہئے۔

اسی طرح ایڈورڈ سعید نے حال ہی میں مغربی عوام کی رائے پر غلبہ پانے والے نظریہ "تہذیبوں کا تصادم" کا جائزہ لیتے ہوئے اسے حد سے زیادہ بچگانہ اور عوامی کہتے ہیں۔ سعید "اسلام ایک ثقافتی شناخت" کے

---

1 . Halliday,Fred, Islamophobia Reconsidered ,Ethnic and Racial Studies, Vol 22, No 5 ، p 895

عنوان سے ایک مضمون میں اس نظریہ پر یوں تنقید کرتے ہیں:

ہنٹنگٹن اپنے خیال میں اسلام اور مغرب کو مکمل طور پر یکساں اور ناقابل تسخیر سمجھتا ہے، اس طرح سے کہ گویا ہر مغرب کا رہنے والا اور ہر مسلمان کو دونوں میں سے صرف ایک کے ساتھ ہی اپنی وفاداری کا اعلان کرنا چاہئے۔ تاہم، حقیقت اس کے خلاف ہے، عالم اسلام اور مغربی دنیا باہم مربوط، متحد اور یکساں نہیں ہیں، بلکہ ہنٹنگٹن کے دعووں کے برخلاف، ان دونوں تہذیبوں میں سے ہر ایک میں تنوع ایک حقیقت ہے جسے قبول کرنا ضروری ہے۔ مثال کے طور پر، "سعودی عرب" کی خشک، ایک جہتی ثقافت میں اور "مصر" کی قدیم و وسیع ثقافت میں کیا مشترک ہے؟

آخر میں، ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ساموئیل ہنٹنگٹن ہمیں جو کچھ بتا رہا ہے، بنیادی طور پر وہ کوئی نئی چیز ہے یا پھر یہ وہی جنگ سرد ہے جسے پھر سے گرم کیا گیا ہے؟ اس کے جواب میں کہنا ہوگا کہ اگرچہ ہنٹنگٹن جنگ سرد کے خاتمے کا زوروں سے اعلان کرتا ہے لیکن در حقیقت "جنگ سرد زندہ باد" کے نعرے کا پاس رکھنا چاہتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں، دنیا کی موجودہ صورتحال کے بارے میں بہتر تفہیم فراہم کرنے کے بجائے، وہ نئے طریقوں اور پالیسیوں کے ذریعے خصوصا میڈیا ٹیکنالوجی کے ذریعے جنگ سرد کو قائم رکھنے اور بڑھاوا دینے کی کوشش میں ہے۔

اس سلسلے میں، کچھ نقادوں کا خیال ہے کہ ہنٹنگٹن کے مطالعہ کی بنیاد "سماجی ڈارون ازم" کا مشہور نظریہ ہے، جس نے بیسویں صدی کے اوائل میں کافی مقبولیت حاصل کی تھی۔ کچھ عام اور مشترک موضوعات جیسے "اغیار کا خوف"، "دروازے پر بربریت" اور "مغرب کی حقیقت کو غیر یورپین کا خطرہ" کا وجود اس انتساب کی تقویت کرتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں ہنٹنگٹن نے واقعی کوئی نئی چیز پیش نہیں کی ہے بلکہ اس نے کئی دہائیوں پہلے کے فریب کار خوف کو نئی شکل و صورت میں پیش کیا ہے۔ اس نے بھورے، پیلے اور سیاہ ڈر کا ترجمہ اسلامی، ہندو اور افریقی تہذیب کے خطرے میں کیا ہے۔

لہٰذا، ہنٹنگٹن کے ذریعہ غیر مغربی تہذیبوں کی وضاحت ان کی تاریخی اور ذاتی خصوصیات نہیں ہیں، بلکہ امریکہ اور اس کے اتحادیوں کے لئے ان کا معاشی، سیاسی، یا فوجی خطرہ ہے۔ اڈوارد سعید کے مطابق: ہنٹنگٹن کا نظریہ پینٹاگون کے منصوبہ سازوں اور امریکا کے فوجی صنعت کے ذمہ داروں کے تناظر میں ہے۔ وہ لوگ جو سرد جنگ کے بعد عارضی طور پر اپنی ملازمت سے محروم ہوگئے تھے اور اب انہیں نوکری کے نئے مواقع میسر ہیں۔

نتیجہ

۱۔ "تہذیبوں کا تصادم" کے نظریہ کو ساموئل ہنٹنگٹن اور برنارڈ لوئیس نے ۱۹۹۰ کی دہائی کے آغاز میں پیش کیا۔ گذشتہ ۲۵ سالوں کے دوران بنیادی نظریاتی دائرہ، اسلام اور مغرب کی دو عظیم تہذیبوں کے درمیان تعلقات کا تجزیہ کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی طے کرنا تھا کہ میڈیا اور مغربی رہنما، مسلمانوں کے ساتھ کیسا برتاؤ کرتے ہیں۔ یہ مسئلہ خاص طور پر گیارہ ستمبر ۲۰۰۱ کے واقعات کے بعد مرکزی دھارے کے ذرائع ابلاغ کی خصوصی توجہ کا مرکز رہا ہے، جس میں سر فہرست نیو یارک ٹائمز، واشنگٹن پوسٹ، وال اسٹریٹ جرنل، این بی سی، سی بی ایس وغیرہ ہیں۔

جیسا کہ ہم نے اس مضمون میں دیکھا ہے، اس پیراڈائم کو جاننا ضروری ہے۔ اس کی کامیابی کے وجوہات اور اس کے عوامی تاثرات، سیاسی حلقوں اور یہاں تک کہ امریکی دانشوروں، نیز اس کے نقادوں پر اس کے گہرے اثرات کو سمجھنا ضروری ہے کیونکہ یہ جاننا ضروری ہے کہ عوام کی بنیادی رائے بنانے والے کی حیثیت سے ذرائع ابلاغ، اسلام کو کس طرح پیش کرتا ہے، سرکاری عہدیدار اور دوسرے مغربی شہری مسلمانوں کے ساتھ مختلف سیاسی، سماجی اور ثقافتی لحاظ سے کس طرح سے پیش آتے ہیں اور ایک لفظ میں کہا جائے کہ معاصر تہذیبوں کے تصادم کے نظریہ کی تحلیل، تجزیہ اور تنقید کیے بغیر معاصر اسلاموفوبیا اور اس کے ہم عصر بنیادوں، اسباب و عوامل کو سمجھنا ممکن نہیں ہے۔

۲۔ پچھلی دو دہائیوں کے دوران، یہ نظریہ بیشتر مغربی مفکرین اور تجزیہ کاروں کے لئے، صریح اور خفیہ طور پر اور شعوری و لاشعوری طور پر، ہمیشہ نظریاتی اساس اور فکری حوالہ رہا ہے۔ انہوں نے اسلام اور مغرب، دو عظیم تہذیبوں کے تاریخی اور عصری تعلقات کی ترجمانی اور ان دونوں تہذیبوں سے وابستہ ممالک پر توجہ مرکوز کرنے کے مقصد کے ساتھ، ایک نظریہ اور قیاس آرائی کی تجویز پیش کی ہے۔

۳۔ یہ نظریہ سیاسی عہدیداروں، میڈیا اور مغرب میں عام لوگوں کے مخالفانہ اقدامات کا جواز بھی پیش کرتا ہے جو خیالی دعووں کی مدد سے جنگ سرد کے بعد کے مغربی دنیا کے تہذیبی تنازعات کو بین الاقوامی منظر نامہ پر اسلام کی بڑھتی حصہ داری اور مغرب کے تئیں مسلمانوں کی دیرینہ منافرت اور دشمنی سے مستند بناتے ہیں۔

۴۔ اس قسم کے تجزیوں نے، خاص طور پر گیارہ ستمبر ۲۰۰۱ کے حوادث اور بعد کے واقعات کے بعد ایک سیاسی اور علمی رنگ اختیار کر لیا اور صحافتی سطح سے آگے نکل کر اس نے تعلیمی اداروں میں بھی اپنا راستہ تلاش کر

لیا۔ ممتاز نظریہ پردازوں کے ذریعہ اس نظریہ کو پیش کرنے کی وجوہات، اس کی مختلف تشریحات، دلائل، دستاویزات اور تاریخی تصدیقات، مختلف تنقیدات، خاص و عام میں اس کی مقبولیت کی مقدار و معیار، موجودہ واقعات کے لئے وضاحتی اور تشریحی صلاحیت اور آخر میں ان دو تہذیبوں کے حال اور مستقبل کے تعامل پر ان نظریات کے منفی اثرات۔ یہ وہ محور ہیں جن پر اس مضمون میں واضح طور پر اور صراحت کے ساتھ گفتگو کی گئی ہے۔

منابع و مآخذ

- امیری وحید، مجتبی، نظریہ برخورد تمدن ہا: ہانتینگتون ومنتقدانش، وزیر امور خارجہ، تہران، ۱۳۸۶
- بیچرانلو، عبداللہ، بازنمایی ایران واسلام در ہالیوود، پژوہشگاہ فرہنگ، ہنر وارتباطات، تہران، ۱۳۹۱
- بیدہام، برایان، اسلام و غرب در نظریہ برخورد تمدن ہا نتینگتن و منتقدانش، ترجمہ مجتبی امیری وحید، وزارت امور خارجہ، تہران، ۱۳۸۶
- روینشتاین، ربچارد وچارل کروکر، چالش باہا نتینگتن در نظریہ برخورد تمدن ہا: ہانتینگتن ومنتقدانش، ترجمہ مجتبی امیری وحید، وزارت امور خارجہ، تہران، ۱۳۸۶
- سعید ادوارد، شرق شناسی، ترجمہ عبدالرحیم گواہی، دفتر نشر فرہنگ اسلامی، تہران، ۱۳۸۲
- سعید ادوارد، اسلام یک ہویت فرہنگی است در نظریہ برخورد تمدن ہا: ہانتینگتن ومنتقدانش، ترجمہ مجتبی امیری وحید،، وزارت امور خارجہ، تہران، ۱۳۸۶
- صالحہ امیری، سید رضا، مفاہیم و نظریہ ہای فرہنگی، ققنوس، تہران، ۱۳۹۲
- صدری، احمد، مصاف تمدن ہاخواب چپ ساموئل ہانتیگتن در نظریہ برخورد تمدن ہاہا نتیگتن ومنتقدانش، ترجمہ مجتبی امیری وحیدی، وزارت امور خارجہ، تہران، ۱۳۸۶
- کرک پاتریک، جین، ضرورت نوین سازی سنت ہا و دگرگونی ہادر نظریہ برخورد تمدن ہا: ہانتیگتن ومنتقدانش، ترجمہ مجتبی امیری وحید، وزارت امور خارجہ، تہران، ۱۳۸۶
- کلمبوس، تئودور وتانوس ورمیس، در جستجوی برہای جدید در نظریہ برخورد تمدن ہاہا نتیگتن ومنتقدانش، ترجمہ مجتبی امیری وحید، وزارت امور خارجہ، تہران، ۱۳۸۶
- لوئیس، برنارد، خاور میانہ دوہزار سال تاریخ از ظہور مسیحیت تاامروز، ترجمہ حسن کامشاد، نی، تہران، ۱۳۸۱
- ناصری طاہری، عبداللہ، مبانی وریشہ ہای تاریخی اسلام ہراسی غرب، مطالعات تاریخ اسلام، شمارہ ۱، ۱۳۸۸

- Abrahamian, Ervand, The US Media, Huntington and September 11, Third World Quarterly, Vol 24, No 3,2003
- Afshar, Haleh, Rob Aitken and myfanwy Franks, Feminism Islamophobia and Identities, Political Studies , Vol 53, No 2,2005
- Ahmad , Fauzia , British Muslim Perceptions and Opinions on News Coverage of September 11,Journal of Ethnic and Migrantion Studies, Vol 32, No , 2006
- Ali, Yasir, Shariah and Citizenship, How Islamophobia is Creating a Second Class Citizenry in America, California Law Reviewm, Vol 100,No 4,2012
- Faimau, Gabriel, Teaching and learning guide for Conflictual Model of Analysis in Studies on the Media Representaion of Islam and Muslims: A Critical Review, Sociology Compass, Vol 9, No 7, 2015
- Halliday,Fred, Islamophobia Reconsidered ,Ethnic and Racial Studies, Vol 22, No 5, 1999
- Marranci,Gabriel, Multiculturalism, Islam and the Clash of Civilisations Theory: Rethinking Islamophobia , Culture and Religion, Vol 5, No1 , 2004
- Poynting , Scott and Victoria Mason, the Resistible Rise of Islamophobia anti Muslim Racism in the UK and Australia before 11 September 2001, Journal of Sociology , Vol 43,No 1,2007
- Saed, Amir , Media , Racism and Islamophobia : the Representaion of Islam and Muslims in the Media , Sociology Compass, Vol 1, No 2,2007
- Semati , Mehdi, Islamiphobia , Culture and Race in the Age of Empire, Cultural Studies, Vol 24, No 2
- Stein, Arlene and Zakia Salim, Manufacturaing Islamophobia: Rightwing Pseudo Documentries and the Paranoid Style, Journal of Communication Inquiry , Vol 39, No 4, 2015